نوآبادیاتی نظام: بین الاقوامی منظر نامہ
(آغاز تا حال۔ایک جائزہ)

ڈاکٹر محمد آصف☆

Dr. Muhammad Asif

Abstract:

Colonialism is actually a policy of to extend the authority over other people's territories. The European colonial period started near about the dawn of 16th century and retained till the mid of 20th century. During this period several European countries established their colonies in different areas of the world especially in Asia, Africa and the Americas. First, the colonial masters took a start with profitable trading or commercialism and then after getting a deep influence in local political structure they came forward to invade those areas with their power. This is an introductory article about the European Colonial System, its norms and pattern to work in different colonies from 16th to mid-20th century.

یورپ کا نوآبادیاتی نظام جس کا آغاز لگ بھگ سولھویں صدی میں ہوا تھا۔ صنعتی انقلاب کے بعد بڑی تیزی سے ایشیا، افریقہ اور آسٹریلیا کے مما لک میں پھیلتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ جنگِ عظیم اول سے قبل تک ''عالمِ مسیحیت کا چابک'' (ترکی) ''یورپ کا مردِ بیمار'' بن چکا تھا۔[(۱)] جنگِ عظیم اول کے خاتمے پر برطانیہ، فرانس اور اٹلی نے جمہوریہ ترکی کے سوا عثمانی سلطنت کے بقیہ علاقوں پر بالواسطہ یا بلاواسطہ اقتدار قائم کرلیا۔ یہاں تک کہ صرف چار مسلم مما لک ترکی، سعودی عرب، ایران اور افغانستان مغرب کے نوآبادیاتی نظام اور مغربی اقتدار سے محفوظ رہے۔[(۲)]

ساتویں صدی عیسوی کے آغاز سے آٹھویں صدی کے وسط تک جو عرب اسلامی لہر اٹھی اس نے آگے چل کر شکل بدل کے تقریباً ایک ہزار سال تک یعنی اسپین میں مسلمانوں کی آمد سے لے کر ترکوں کی جانب سے ویانا کے دوسرے محاصرے (۱۶۸۳ء) تک یورپ کو خوفزدہ رکھا۔ تاہم یہ بھی حقیقت ہے

☆ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبۂ اُردو، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

کہ اسلام کی بنیادوں میں زوال و اضمحلال کے آثار تیرھویں صدی میں یعنی سقوطِ بغداد (۱۲۵۶ء) کے بعد ہی سے پیدا ہونا شروع ہو گئے تھے۔ بالکل اسی طرح یورپ میں نشاۃ الثانیہ سولھویں صدی میں وجود میں آئی تاہم اس سے قبل ہی انہی صدیوں میں یورپ میں روشنی کی کرنیں آنی شروع ہو گئی تھیں۔ چنانچہ زوالِ بغداد کے بعد سے مسلمانوں میں سائنسی و علمی ترقی کا جذبہ ماند پڑنا شروع ہوا۔ علمی تحقیق اور آزادیٔ فکر و نظر مفقود ہوتی چلی گئی۔ انہی صدیوں میں بالخصوص سولھویں صدی میں یورپ میں احیاء العلوم اور اصلاحِ مذہب تحریکیں برپا ہوئیں۔ صدیوں کی تاریکی کے بعد سویا ہوا یورپ بیدار ہوا۔ نشاۃ الثانیہ، خرد افروزی، معاشی اور معاشرتی ترقی کی بنیادیں استوار ہوئیں۔ آزادیٔ فکر و نظر کی کشتیِ نازک رواں ہوئی۔ سائنسی و علمی تحقیق کی بدولت اٹھارویں صدی میں یورپ میں صنعتی انقلاب نے جنم لیا۔ اسی احیائے علوم کی بدولت سائنس اور فلسفے کی نئی بنیادیں استوار ہوئیں۔ اسی آزادیٔ فکر و نظر کے تقاضوں کے صنعتی انقلاب کی بدولت صنعتی تمدن نے جنم لیا۔

فرسودہ عقائدِ معاشرت و مذہب اور پرانی سیاست گری خوار ہوئی۔ پرانی اقدار پرانا طرزِ فکر سرنگوں ہوا اور جدید صنعتی ترقی یافتہ مغربی تہذیب و تمدن نے جنم لیا۔ اسی صنعتی انقلاب اور نئی طرزِ معیشت کی بدولت نوآبادیاتی نظام کی تشکیل ہونا شروع ہوئی۔ ادھر مشرق میں روحِ اسلام مطلق العنان ملوکیت اور تنگ نظر ملائیت کے حبسِ بے جا میں گرفتار ہو کر رہ گئی۔ علم و تحقیق کا ذوق ماند پڑا تو اجتہاد کے دروازے بند ہو گئے۔ علمی و سیاسی تنزل نے قنوطیت اور جبریت پر مبنی طرزِ فکر کے ذریعے تحقیق و تجسس کا خاتمہ کر کے رکھ دیا۔ اسی زمانے میں مغربی جہاز ران دور دراز خطوں کے پُرخطر سفروں پر روانہ ہوئے اور اپنے ہم وطنوں کے سامنے ''مشرقِ بعید'' اور ''نئی دنیا'' کے دروازوں کو کھول دیا۔ صنعتی انقلاب آیا تو مغرب میں صنعت و تجارت کو بے پناہ ترقی ہوئی اشیا کی کھپت کے لیے منڈیوں کی ضرورت پیش آئی چنانچہ ایشیا، افریقہ، آسٹریلیا اور لاطینی امریکہ کے خطوں میں نوساختہ اشیا کی کھپت کے لیے نئی نئی منڈیوں اور نوآبادیوں کی تلاش شروع ہوئی۔ رفتہ رفتہ ان ممالک پر اہلِ یورپ کا تجارتی، حاکمانہ، عسکری اور سیاسی تسلط قائم ہوتا گیا۔ اس دوران میں مشرقی اقوام بالخصوص مسلمانوں کا حصہ یہ تھا کہ وہ بدلتی ہوئی دنیا سے آنکھیں بند کر کے اپنے ہزار سالہ نشۂ عروج میں مست رہے۔ بالخصوص مسلمانوں کی حالت بہت خوار و زبوں تھی وہ ''قدیم تہذیب کا خستہ لبادہ اوڑھے'' نہایت سکون سے بیٹھے رہے۔ مغربی اقوام اپنے کام میں مشغول رہیں۔ اس کے نتیجے میں دفعتاً مغربی صنعتی تمدن کا سیلاب اٹھا اور ایک صدی کے اندر اندر اپنے اقتدار کے شکنجوں میں ساری دنیا کو جکڑ لیا۔ ان کو (مسلمانوں کو) احساس ہی نہ ہوا کہ وہ مغربی قوموں کے سیاسی و معاشی اقتدار اور استبداد سے مغلوب ہو چکے ہیں۔ وہ اپنے باہمی نفاق، جہالت، تنگ نظری، قدامت اور ''حبطِ عظمت'' کی وجہ سے مغرب کے صنعتی انقلاب اور بڑھتے ہوئے طوفان کی ماہیت کو سمجھ ہی نہ سکے نہ اس کا مقابلہ کر سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اکثر مسلم ممالک جو آزاد و مختار تھے وہ اب سیاسی و معاشی طور پر مغرب کی کالونیوں میں بدل گئے۔

اٹھارویں صدی کے نصف آخر اور انیسویں صدی کے نصف اوائل میں مسلم نوآبادیوں میں اپنی شناخت، اپنے حقوق اور اپنی زندگی کے آثار پیدا ہونے لگے اور جا بجا مختلف تحریکیں سر اٹھانے لگیں اور ان تحریکوں کی بدولت جدید احیائے اسلام کا عمل ظہور پزیر ہوا۔ اس امر کی طرف اشارہ ضروری ہے کہ عالمِ اسلام کا بحران بیرونی قوتوں کی کارکردگی کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ اس کے اسباب داخلی تھے۔ اقبال کے نزدیک وہابی تحریک جو اگرچہ عقائد میں شدید اور قدامت پرست تھی جدید اسلام میں زندگی کی پہلی دھڑکن تھی۔ سرسید (ہندوستان میں)، افغانی (افغانستان اور دیگر اسلامی ممالک میں)، مفتی عالم جان (روس میں) اس تحریک سے متاثر تھے۔ ان عظیم شخصیات نے یہ جان لیا تھا کہ تین بڑی قومیں عالمِ اسلام پر حکمران ہیں انہوں نے اپنی تمام توانائی ان قوتوں کے خلاف برپا کرانے میں مرکوز کر دی۔

(i) ملائیت (ii) تصوف (iii) ملوکیت

یہ لوگ اور ان کے سینکڑوں پیروکار مغرب زدہ مسلمان نہیں تھے یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے مکتبِ قدیم کے ملاؤں کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا تھا۔ البتہ مغرب کے جدید خیالات سے یہ لوگ متاثر ضرور تھے۔ ان عظیم رہنماؤں نے مسلمانوں کی پستی کا علاج جدید تعلیم کو قرار دیا اور اسلام کی تازہ تعبیر کی ضرورت محسوس کی۔[۳] یہ تحریکیں مسلمانوں کے سیاسی، اخلاقی، دینی، معاشی زوال کے باعث ابھری تھیں چنانچہ ان کا مقصد بھی ان تمام خرابیوں کی بیخ کنی تھا جو مسلمانوں کے زوال کا سبب تھیں۔ اگرچہ یہ تحریکیں خالصتاً مسلم ممالک کے اندرونی اور داخلی حالات کی پیداوار تھیں تاہم آگے چل کر رفتہ رفتہ ان میں بیرونی مغربی استعمار کے خلاف جدوجہد کا عنصر کا بھی شامل ہو گیا۔ چنانچہ ان تحریکوں کا ایک زاویہ اصلاحی تھا تو دوسرا سیاسی۔ دنیا بھر کے مسلمانوں کو ان تحریکوں نے متاثر کیا۔ اگرچہ تحریکیں دنیائے اسلام کے مختلف خطوں میں ابھریں اس لیے ان تحریکوں کا ایک دوسرے سے واضح تعلق تو نہ تھا اور ان تحریکوں کے محرکین و مصلحین نے اپنے اپنے علاقوں کی مخصوص سیاسی، سماجی، معاشی، نفسیاتی اور ذہنی فضا کے مطابق طریق کار اختیار کیا۔ اس طرح داخلی اعتبار سے یہ تحریکیں ایک دوسرے مختلف تھیں لیکن چونکہ یہ تحریکیں مجموعی طور پر مسلمانوں کے دینی، اخلاقی اور سیاسی تنزل کے ردِعمل میں رونپذیر ہوئی تھیں اس لیے دنیائے اسلام کے مختلف حصوں میں مشابہہ صورتحال کے سبب جہاں کہیں بھی یہ تحریکیں قومیتِ اسلام کے جذبے کے تحت ابھریں اور اسی جذبے کے تحت ان کا نصب العین اسلام کی اصل پاکیزگی کی طرف ازسرِ نو رجوع، ملوکیت، مُلائیت اور خانقاہیت کے سبب پیدا ہو جانے والی مطلق العنانیت، علماء کی موقع پرستی، صوفیا کی ریاکاری اور عوام الناس میں پیدا ہو جانے والی ضعیف الاعتقادی او توہم پرستی دوسرے لفظوں میں بحیثیت مجموعی مسلمانوں کے داخلی انحطاط، غیر مسلم حاکموں کے استعمار و استبداد یا روس اور یورپ کی نوآبادیاتی قوتوں کے ظلم و استعمار کے خلاف شدید احتجاج تھا۔ جیسا کہ سید احمد شہید بریلوی نے ہندوستان میں، محمد السنوسی نے شمالی افریقہ میں برطانوی استعمار کے خلاف احتجاج کیا اور برصغیر میں آگے چل کر

تحریکِ مجاہدین ہی نے برطانوی استعمار کے خلاف تحریکِ آزادی کی شکل اختیار ی۔ چنانچہ عہدِ حاضر میں احیائے اسلام کا ظہور اٹھارہویں صدی کے وسط میں ابن الوہاب (۱۷۰۳ء۔۱۷۸۷ء) کی اصلاحی تحریک سے ہوا جو عثمانی سلطنت وملوکیت کی وجہ سے پیدا ہونے والے مسلمانوں کے اخلاقی اور سیاسی زوال کے ردِ عمل میں ابھری تھی۔ اس تحریک کے زیر اثر دنیائے اسلام کے مختلف خطوں میں مشابہت کے سبب تیزی سے ایسی تحریکیں وجود میں آتی چلی گئیں۔ یہ تحریکیں بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر اس تحریک سے متاثر تھیں۔ مثلاً ایران میں مرزا محمد علی باب، الجیریا میں محمد بن علی سنوسی، روس میں مفتی عالم جان، ترکی میں مدحت پاشا اور فواد پاشا، تیونس میں خیر الدین پاشا، مصر میں جمال الدین افغانی اور اخوان المسلمون، ہندوستان میں ولی اللٰہی تحریک اور پھر علی گڑھ تحریک وغیرہ۔

اسلام اور مغرب کا باہمی تعارف بہت قریب سے صحیح معنوں میں اس وقت ہوا جب امپریلزم کے دور میں انیسویں صدی میں مغرب نے سیاسی اور اقتصادی مفادات کی خاطر اپنا آہنی اور مضبوط ہاتھ مشرق کی طرف بڑھایا۔ چنانچہ اسلام کا جدید احیاء اگرچہ وہابی تحریک کے ہاتھوں وجود میں آیا لیکن مغرب سے براہِ راست تعلق کے باعث نئے نظریات مثلاً نیشنلزم، لبرل ازم، سیکولرازم، انفرادیت پسندی، جمہوریت، دستور پسندی، وسیع النظری اور روشن خیالی کے تصورات دنیائے اسلام میں در آئے جن کی بدولت دو ایک نسلوں کے بعد مسلمانوں میں لبرل ازم یا روشن خیالی کی تحریکیں وجود میں آئیں اور کچھ ایسے مصلحین پیدا ہو گئے جنھوں نے جدید نظریات کی مخالفت کی بجائے ان کو اسلامی رنگ دینا شروع کیا اور اسلام کی تطبیق جدید اصولوں پر کی جانے لگی۔ مثلاً ہندوستان میں سر سید، مصر میں جمال الدین افغانی اور محمد عبدہ، وسط ایشیا مفتی عالم جان اور ترکی میں مدحت پاشا۔ اس طرح مسلمانوں میں مغرب کے زیرِ اثر جدیدیت اور قدامت پسندی سے وابستہ دو گروہ وجود میں آئے اور مسلمانوں میں قدامت اور جدیدیت کی کشمکش شروع ہوئی لیکن جہاں تک نوآبادیاتی طاقتوں کے خلاف جدوجہد کا تعلق ہے تو دونوں گروہوں نے اپنے اپنے انداز میں اسلام کے دینی وعلاقائی دفاع میں مغرب اور روس کی نوآبادیاتی طاقتوں کے بیرونی استعمار کے خلاف علمی اور عملی جدوجہد میں حصہ لیا۔ بہر حال مغرب کے زیر اثر جدید تہذیب وتمدن کے پھیلاؤ نے مسلمانوں میں قدیم اور جدید افکار کے درمیان سخت کشمکش پیدا کر دی۔ قدیم وجدید کی یہ کشمکش مسلم ممالک کے لیے اس وقت بھی سب سے اہم اور مرکزی مسئلہ ہے۔ تاہم ماضی کی طرح آج بھی اس نئے نوآبادیاتی نظام کے دور میں دونوں گروہ نئی استعماری طاقتوں کے خلاف احتجاج اور جدوجہد میں اپنے اپنے نئے انداز میں حصہ لے رہے ہیں۔ بہر حال جدید دنیائے اسلام میں مغربی نوآبادیاتی طاقتوں کے خلاف شدید احتجاج کی لہر پیدا کرنے اور اس کے ساتھ ساتھ جدید دنیائے اسلام میں موجود قدیم اور جدید کے مخالفانہ رجحانات کے درمیان مصالحت کرانے میں عموماً جمال الدین افغانی اور ان کے بعد اقبال کا نام لیا جاتا ہے جنھوں نے عالمی سطح پر جدید دنیائے اسلام کو مغربی نوآبادیاتی نظام

سے نجات دلانے کی کوششیں کیں اور یہ نہ صرف خود اپنے گرد و پیش کی تحریکوں سے متاثر ہوئے بلکہ متاثر بھی کیا، اس طرح جدید دنیائے اسلام کا باقاعدہ آغاز امپریلزم کے دور میں انیسویں صدی میں مغربی استعمار سے آویزش اور آمیزش کے سبب ہوا۔ (۴)

اسلام اور مغرب کا آمنا سامنا سب سے پہلے باقاعدہ طور پر صلیبی جنگوں میں ہوا تھا لیکن جیسا کہ مندرجہ بالا سطور میں ذکر ہوا کہ اسلام اور مغرب کا باہمی تعارف بہت قریب سے صحیح معنوں میں اس وقت ہوا جب امپریلزم کے دور میں انیسویں صدی میں مغرب نے سیاسی اور اقتصادی مفادات کی خاطر اپنا آہنی اور مضبوط ہاتھ مشرق کی طرف بڑھایا۔ ایشیا کو مہذب بنانے کے لیے جس مشن کو سرمایہ دارانہ نظام کے طور پر پیش کیا گیا وہ انسان دوستی کے روپ میں ایک دیو استبداد تھا جو نیلم پری بن کر جمہوری قبا میں پائے کوب تھا۔ اس امپریلزم کی سرپرستی میں صنعتی انقلاب کی کوکھ سے جس سرمایہ دارانہ نظام نے جنم لیا اس کا چہرہ روشن تھا مگر اندرون چنگیز سے تاریکِ تر مغرب کے ساتھ اس سامراجی رابطے کے نتیجے میں تاریخی شعور، نیشنلزم اور تہذیبی عظمت پر فخر و ناز کے جذبے کے تحت نو آبادیاتی نظام کے خلاف ایشیا میں مزاحمت شروع ہوئی۔ چنانچہ مغربی استعماریت کی پسپائی ۱۹۲۰ء اور ۱۹۳۰ء کی دہائیوں میں آہستہ آہستہ شروع ہوئی اور جنگِ عظیم دوم کے بعد بہت تیز ہوگئی۔ سویت یونین کے خاتمے کے نتیجے میں مزید مسلمان معاشرے آزاد ہوئے۔ (۵)

بظاہر ایسا لگتا ہے کہ دوسری جنگِ عظیم کے بعد یورپی نو آبادیاتی نظام ختم ہوگیا۔ ایشیا یورپی تسلط سے آزاد ہوگیا۔ لیکن درحقیقت دوسری جنگ عظیم کے بعد امریکہ کا اثر و رسوخ ابھرنا شروع ہوا۔ امریکہ کے زیرِ سرپرستی ایک نیا بین الاقوامی معاشی نظام تشکیل دیا گیا۔ نو آبادیات کو آزاد کرنا، ان کی منڈیوں پر قبضہ کرنا اور وہاں سے خام مال حاصل کرنا اس نظام اور منصوبے کے اہم اجزاء تھے۔ اس لیے دوسری جنگِ عظیم کے ختم ہوتے ہی اتحادی طاقتوں نے امریکہ کی سربراہی میں اس بین الاقوامی معاشی نظام کو تسلیم کیا اس کے نتیجے میں ورلڈ بینک (World Bank) اور آئی ایم ایف (I.M.F) جیسے اداروں کی تشکیل ہوئی۔ چند سالوں کے اندر اندر آزاد دنیا کی معیشت کے گرد سیاسی و فوجی حصار باندھا گیا۔ کمیونزم کے خلاف سرد جنگ شروع ہوئی۔ سرد جنگ کے خاتمے کے بعد امریکہ یک قطبی طاقت بن کر سامنے آ گیا۔ جس کا اتحادی یورپ تھا۔ اس طرح یہ نیا امپریلزم یا نیا نو آبادیاتی نظام (Neo-colonialism) وجود میں آیا۔ جس کا اتحادی یورپ تھا جس کی جڑیں یورپی نو آبادیاتی نظام ہی میں پیوست تھیں۔ یورپی امپریلزم کی طرح امریکی امپریلزم کا مقصد بھی بظاہر غیر مہذب کو مہذب اور ترقی یافتہ بنانا تھا۔ لیکن حقیقت میں آزاد نو آبادیات کے ذرائع پیداوار کو کنٹرول کرنا ان کو اپنی ترقی میں استعمال کرنا اس کا حقیقی مقصود تھا۔ اس طرح افریقہ اور ایشیا میں امریکی امپریلزم ذرائع ابلاغ اور بین الاقوامی اداروں کے ذریعے مسلط کیا گیا ہے اور ان اداروں کو تیسری دنیا کے غیر مستحکم ملکوں میں سرمایہ کاری کے لیے استعمال کیا جاتا

ہے۔ امریکہ، مغربی ممالک اور عالمی ادارے تیسرے دنیا کے غیر مستحکم ممالک کو قرضے دے کر ان کو محکوم بناتے ہیں اور اپنی مرضی سے ان کی حکومت چلاتے ہیں۔ جہاں امریکہ اِن ڈائریکٹ (Indirect) طریقوں میں ناکام ہوجاتا ہے وہاں وہ براہِ راست مداخلت کر کے اپنے مفادات کا تحفظ کرتا ہے۔ ۱۹۴۵ء میں امریکہ نے یونان، کوریا، ویت نام، لبنان، گرینڈا اور ال، سلواڈور میں مداخلت کی۔ اس کے علاوہ جب ضرورت پڑی تو اس نے یونان، ترکی، گوئٹے مالا، جنوبی ویت نام، کمبوڈیا، جنوبی کوریا، لبنان، چلی، گھانا، زائرے، مالے پاکستان وغیرہ کی حکومتوں کو بدلا۔[۶] یہ وہی مشن ہے جس کا بیڑہ یورپی نوآبادتی نظام نے اٹھایا تھا لیکن اس کا اندرون کتنا تاریک تر ہے اس کا اندازہ افغانستان وعراق عوام الناس کی تباہی وبربادی اور پسماندہ ممالک کی پسماندگی سے ہوتا ہے۔ اس طرح یہ نیا نوآبادیاتی وہی سازِ کُہن ہے جس کے پردوں میں نوائے قیصری کے سوا کچھ اور نہیں۔

جس طرح براہِ راست نوآبادیاتی نظام کے دور میں اس کے خلاف ردِعمل کی تحریکیں ابھریں تھیں اسی طرح عہد جدید میں بھی مغرب کے اس نئے بالواسطہ استعمار اور ظلم واستبداد کے مقابلے میں ایشیا وافریقہ میں بیداری کی لہر چلتی رہی ہے۔ ایشیائیوں نے زیادہ سے زیادہ اپنا معاشی اثبات کرنا شروع کردیا ہے۔ ملائشیا، چین اور جاپان بالخصوص اس کی نمایاں مثالیں ہیں۔ اس کے علاوہ مغربی تہذیب اور مغربی نوآبادیاتی نظام کے مقابلے میں اسلام پسندی کی تحریکیں بھی موجود ہیں۔ ہنٹنگٹن کے بقول:۔

> ''ایک وسیع علمی، ثقافتی، معاشرتی اور سیاسی تحریک ہے جو پورے عالمِ اسلام میں پھیلی ہوئی ہے۔''[۷]

اس میں جدیدیت کو قبول کرنا، مغربی ثقافت کو رد کرنا اور جدید زندگی میں رہنمائی کے لیے اسلام سے ازسرِنو وابستگی شامل ہے۔ گویا یہ تحریکیں جدید انداز میں براہِ راست نوآبادیاتی دور کی تحاریکِ مزاحمت کا تسلسل ہیں۔ یہ تحریکیں مصر، انڈونیشا، افغانستان، پاکستان، ایران، الجزائر، ترکی، سعودی عرب، مراکش، لیبیا، شام، تیونس، عراق، یمن، سوڈان وغیرہ وغیرہ تقریباً تمام عالمِ اسلام میں موجود ہیں اور اس کے ساتھ ایشیا کے دیگر ممالک بھی اپنی ثقافت اور معاشی اثبات پر زور دے رہے ہیں۔ ترقی اور اثبات کا یہ عمل ہانگ کانگ، تائیوان، جنوبی کوریا اور سنگاپور وغیرہ اس کے علاوہ چین، ملائشیا، تھائی لینڈ، انڈونیشا، پاکستان، ویت نام، جاپان وغیرہ میں موجود ہے۔[۸] لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ جس طرح نوآبادیاتی نظام نے ایک نئی شکل اختیار کی ہے اسی طرح نوآبادیاتی نظام کے خلاف اس جہد ومزاحمت نے بھی ایک نیا انداز اختیار کیا ہے۔ بحیثیت مجموعی اب جدیدیت کو قبول کر کے اور مغربی ثقافت کو رد کر کے اس کے خلاف مزاحمت کا اظہار کیا جاتا ہے اور یقیناً اس کے ڈانڈے بھی ماضی کی تحریکوں سے جا ملتے ہیں۔ ان مزاحمتی تحریکوں کے پس منظر میں انقلابِ اسلامی ایران، افغان روس جنگ اور خلیج کی جنگ کا تذکرہ ناگزیر ہے۔ ۱۹۷۹ء میں انقلاب اسلامی ایران نے عالمی سیاست کے منظرنامے کو یکسر منقلب کردیا۔

مغرب کی مادیت کے مقابلے میں یہ انقلاب اسلامی نظام اور روحانیت کا علمبردار تھا۔ کئی مسلم ممالک اور اسلام پسند تنظیموں نے امریکی و یورپی سامراج کو شکست دینے انقلاب اسلامی کو برپا کرنے کے لیے ایران کی مالی اور عسکری مدد کی۔ نہ صرف ایران میں بلکہ اسلامی تہذیب سے وابستہ کوئی مسلم ممالک میں مغربی استعمار کے خلاف اتحاد و تعاون کو فروغ حاصل ہوا۔ امام خمینی اور قذافی نے باقاعدہ طور پر مغرب اور امریکہ کے خلاف جہاد کا اعلان کیا۔[9] اللہ کی واحدانیت اور اس کی بندگی پھر اس واحدانیت اور بندگی کے حوالے سے انسانوں کی آزادی کی بشارت، پھر اللہ کی وحدانیت کے حوالے سے انسانیت کی وحدانیت پھر انسانیت کی وحدانیت کے حوالے سے انسانوں کے درمیان عدل و مساوات ''انقلابِ اسلامی کی فکری بنیادیں یہی ہیں جو مظلوم اور محروم اقوام، مستضعفین کو استعمار کی طاقتوں اور مستکبرین کے خلاف مقاومت اور مبارزت کا حوصلہ عطا کرتی ہیں۔ مغرب کے استعماری نظام کے لیے انقلابِ اسلامی کی یہی فکری اساس اصل خطرہ تھی جس نے تمام دنیا میں بیداری کی ایک نئی لہر پیدا کر دی۔[10]

افغان سوویت یونین جنگ ۱۹۷۹ء سے ۱۹۸۹ء تک لڑی گئی اس جنگ میں سوویت یونین کو جن عوامل نے شکست سے دو چار کیا وہ ''امریکی ٹیکنالوجی، سعودی عرب کی دولت، مسلم آبادیات اور جوش وجذبہ تھے چنانچہ امریکی ڈالر اور میزائل اس کے ساتھ ساتھ عالمِ اسلام کی اجتماعی کوششوں نے روس کو شکست دی۔ اہلِ مغرب کی نگاہ میں بالعموم اور امریکہ کی نگاہ میں بالخصوص افغانستان کی سرد جنگ کی فیصلہ کن فتح تھی جبکہ مسلمانوں یہ جنگ جہاد کی حیثیت سے لڑی۔ چنانچہ فتح حاصل کرنے کے لیے مسلمانوں کو مجاہدین کا نام دیا گیا اور اشترا کی روس کو الحاد اور دہریت کا۔ مغرب کی طرف سے 'الحاد' کو مٹانے کے لیے 'مجاہدین' کو سپورٹ کیا گیا۔ کیونکہ امریکہ کے لیے یک قطبی طاقت بننے کے لیے ضروری تھا کہ افغانی فتح یاب ہوں۔ چنانچہ 'الحاد' اور 'مجاہدین' کے ذریعے امریکہ کی سوویت یونین کے خلاف اس پراکسی وار میں پورے عالمِ اسلام کے جوش وجذبے کو ابھارا گیا۔ اس طرح مسلمان جسے ''اسلام'' کی فتح سمجھتے ہیں مغرب اسے ''آزاد دنیا'' کی فتح سمجھتا ہے۔

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ مغرب کی سپورٹ سے جو لوگ ''جہاد'' کر رہے تھے وہ ذہنی طور پر مغرب کی مادی غیر اخلاقی تہذیب کے خلاف تھے۔ اسی طرح جو مغرب امریکہ کی سربراہی میں افغان مجاہدین کو سپورٹ کر رہا تھا وہ دراصل کمیونزم کے خاتمے کے لیے اسلامی جماعتوں کی حمایت کا ضرورت مند تھا لیکن اندرونی طور پر اسلام سے خائف۔ نتیجتاً فتح یاب ہونے کے بعد کامیابی سے سرشار، جذبۂ جہاد سے لبریز، بااعتماد مجاہدین کا رُخ اب مغرب کی طرف ہو گیا اور مغرب نے کمیونزم کے خاتمے کے بعد مسلمانوں کو ایک پُرتشدد قوم کے روپ میں ابھار کر اگلا نظریاتی چیلنج قرار دے دیا۔[11]

چنانچہ ۱۹۸۹ء میں روس نے افغانستان سے اپنی فوجیں نکالنی شروع کیں۔ اس کے فوراً بعد ۱۹۹۰ء میں خلیج کی جنگ شروع ہوگئی۔ ہنٹنگٹن نے افغان روس جنگ اور خلیج کی جنگ کے حوالے سے

لکھا:

''افغان جنگ تہذیبی جنگ بن گئی کیونکہ مسلمانوں نے اسے ہر جگہ اسی رنگ میں دیکھا اور سوویت یونین کے خلاف متحد ہو گئے۔ جنگِ خلیج تہذیبی جنگ بن گئی کیونکہ مغربی ممالک نے ایک مسلم تنازے میں فوجی مداخلت کی۔ اہلِ مغرب نے اس مداخلت کی بھرپور حمایت کی اور پوری دنیا میں مسلمانوں نے اسے اپنے خلاف جنگ سمجھا۔ اسے مغربی سامراجیت کی ایک اور مثال سمجھتے ہوئے اس کے خلاف متحد ہو گئے۔''(۱۲)

سرد جنگ کے دوران روس افغان جنگ پہلی تہذیبی جنگ تھی جس میں امریکہ نے مغرب کے ساتھ مل کر، مسلمانوں کو ساتھ ملا کر، پراکسی وار (Proxy War) لڑی اور کمیونزم کو شکست دے کر لبرل ازم کی فتح حاصل کی۔ سرد جنگ کے خاتمے کے بعد پہلی تہذیبی جنگ، جنگِ خلیج تھی جو براہِ راست مغرب اور مسلمانوں کے درمیان تھی۔ تہذیبوں کی اس جنگ میں جو فتح حاصل ہوئی اس کے نتیجے میں ''خلیج فارس امریکی جھیل بن گیا۔'' امریکہ دنیا کے سب سے بڑے تیل کے ذخائر تک پہنچ گیا اور خلیج میں زمانۂ امن میں بھی اپنی فوج تعینات رکھنے میں کامیاب رہا۔ تیل کا وہ ہتھیار جو عرب دنیا مغربی استعمار کے خلاف استعمال کر سکتی تھی اب امریکہ کی زیرِ نگرانی آ گیا۔ مصر، شام، عرب، ترکی، ایران، چین، الجزائر، مراکش، پاکستان وغیرہ سب نے اسے ''امریکی نوتوسیع پسندی'' کھلم کھلا جارحیت''، ''مشرق بمقابلہ مغرب''، ''دقیانوسی سامراجیت کا نیا ابال'' قرار دیا۔(۱۳) پورا عالمِ اسلام مغرب کے لیے تشدد پسند بن گیا۔ سرد جنگ کے بعد کمیونزم کا خطرہ ختم ہوتے ہی مغرب کے نزدیک عالمِ اسلام تنگ نظر، بنیاد پرست، آمریت پسند، دہشت گرد، تشدد پسند اور غیر مہذب بن کر نہ صرف مغرب کے لیے بلکہ پوری دنیا کے لیے خطرہ کی شکل میں ابھر کر سامنے آ گیا۔ ہنٹنگٹن نے لکھا کہ:۔

''اسلام کی سرحدیں خونی ہیں۔'' ''مسلمانوں کا جھگڑالو پن مُسلّم ہے جس سے مسلمان انکار کر سکتے ہیں نہ غیر مسلم۔'' ''اسلام ابتدا ہی سے تلوار کا مذہب رہا ہے۔'' قرآن اور مسلم عقائد کے دوسرے بیانات میں تشدد کے امتناع کے بارے میں بہت کم احکامات ہیں اور عدم تشدد کا تصور مسلم عقائد اور عمل نہیں پایا جاتا۔''(۱۴)

۹/۱۱ کے واقع کے بعد تو اسلام اور عالمِ اسلام پر تشدد اور دہشت گردی کی مہر ہی لگ گئی۔ اس عرصے میں ذرائع ابلاغ نے جو پروپیگنڈہ کیا اس نے اسلام کے امیج کو مغرب اور امریکہ میں بے حد خراب کیا۔ امریکہ نے دہشت گردی، تشدد اور بربریت کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ اس اعلان کے بعد سامراجی قوتوں کو گویا لائسنس مل گیا اور دہشت گردی اور جدوجہدِ آزادی کا فرق مٹنے لگا۔ عالمِ اسلام میں چلنے والی آزادی کی تحریکیں بھی دہشت گردی کی تحریکیں بن کر رہ گئیں۔ تمام دنیا اور دنیائے اسلام نے دہشت گردی کے خلاف جنگ میں اپنی حمایت کا اعلان کیا لیکن اس کے ساتھ ساتھ امریکہ و مغرب کو

دہشت گردی اور تحریکِ آزادی میں فرق روا رکھنے کی تلقین اور دہشت گردی کے نام پر امریکی ظلم و استبداد افغانستان اور عراق کے معصوم عوام کی بے دریغ تباہی اور قتلِ عام پر تنقید بھی گئی۔ عالمِ اسلام کی اسلام پسند تنظیمیں مغربی نوآبادیاتی استعمار کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئیں۔ گویا ۱۱/۹ کے بعد کی صورتحال بھی خلیج کی جنگ والی ہے۔ تمام عوام امریکہ کے نئے نوآبادیاتی نظام کے خلاف ہیں۔ مختلف ممالک میں مغرب نواز حکومتوں کے خلاف بھی تحریکیں چل رہی ہیں۔ بنیاد پرست، تنگ نظر مسلمانوں کے ساتھ ساتھ روشن خیال مسلمان بھی امریکی و مغربی جارحانہ رویے، امریکہ کی توسیع پسندی اور نئے اقتصادی سامراجی استعماری نظام سے نالاں اس کے خلاف ہیں۔ یہاں تک کہ امریکہ کے یک طرفہ رویے اور اقوامِ متحدہ کی خلاف ورزیوں (مثلاً عراق پر حملہ) کو خود مغربی برادری نے بھی تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔(۱۵) پاکستان کے معروف مؤرخ ڈاکٹر مبارک علی نے مغرب کے وہ جرائم جو اس نے تہذیب کے نام پر کیے ان کی تفصیل اپنے ایک مضمون ''تہذیب کے نام پر جرائم'' میں بیان کی اور لکھا کہ:۔

> ''جب تک امریکی و یورپی فتح منداور کامیاب ہیں اس وقت تک وہ اپنے اعمال کے منصف خود ہیں۔ ان کے تمام جرائم تہذیب کے نام پر جائز ہیں۔ افسوس اس بات کا ہے جو لوگ ان کے ظلم وستم کا شکار ہوئے ان کی کوئی آواز نہیں جو تاریخ کو الٹ پلٹ دے۔''(۱۶)

ڈاکٹر جاوید اقبال نے اپنی کتاب ''افکارِ اقبال (تشریحاتِ جاوید)'' میں لکھا کہ:۔

> ''جو صلیبی جنگیں ہوئیں بلکہ آج بھی جو صلیبی جنگ اسلام کے خلاف لڑی جا رہی ہے، اس کا پس منظر کسی نہ کسی صورت میں اسلام کے خلاف وہی قدیم مسیحی مذہبی منافرت ہی کا جذبہ ہے۔''(۱۷)

ڈاکٹر شمیم حنفی نے اپنے مضمون ''تہذیبوں کے تصادم کا مسئلہ اور اقبال'' میں لکھا کہ:۔

> ''اس سوال کا کیا جواب ہوسکتا ہے کہ تاریخ اور انسان کے اجتماعی ارتقا کی ضامن لے دے کر صرف امریکہ کی آزاد جمہوریت ہے۔ جارحانہ عزائم پر مبنی سیاست اور اپنے اقتصادی مفادات کو ترقی دینا تہذیب کی ترقی کا ذریعہ تو نہیں بن سکتا۔۔۔۔ امریکی حکومت کا یہ دعویٰ کہ اسے دراصل انسانیت اور تہذیب کے تحفظ اور انصاف کو قائم رکھنے کے لیے ضروری اقدامات کرنے ہیں سراسر فریب دکھائی دیتا ہے۔''(۱۸)

کیرن آرمسٹرانگ نے لکھا:۔

> ''صدر جارج واکر بُش نے بین الاقوامی دہشت گردی کے خلاف ایک نئی مہم کی منصوبہ بندی کرتے ہوئے۔ اپنے فوری جوابی حملے کو صلیبی جنگ (کروسیڈ) قرار دیا۔۔۔ اس طرح ہم موجودہ تنازعے کی جڑیں ۲۵ رنومبر ۱۰۹۵ء تک موجود پا سکتے ہیں۔۔۔ یہ ایک الم ناک حقیقت ہے کہ ہماری مقدس جنگیں (Holy War) جاری ہیں۔۔۔ صلیبی جنگی جنون دورِ وسطیٰ کی مردہ روایت نہیں بلکہ یہ یورپ اور امریکہ میں آج بھی زندہ ہے۔ شاید ان پرانے

صلیبی جنگی رجحانات کو راتوں رات بدلنا ہمارے لیے ناممکن ہے۔۔۔ہم مغرب والوں کو اس تکلیف دہ مرحلے سے لازماً گزرنا ہوگا تا کہ ہم اپنی پرانی جارحیت سے چھٹکارہ حاصل کریں اور ایک نئے شعورِ ذات کی طرف طویل سفر کا آغاز کریں۔"(۱۹)

اس وقت صورتحال یہ ہے کہ چونکہ معدنی تیل کا کم وبیش ۷۰ فیصد حصہ مسلم ممالک میں ہے اور اس صنعتی دور میں قوت کا معیار بھی معدنی تیل ہے اس لیے سرمایہ دارانہ نظام (جس کا لیڈر امریکہ ہے) کی آماجگاہ دنیائے اسلام ہے۔ معدنی تیل پیدا کرنے والے مسلم ممالک صنعتی ممالک کی بہترین منڈیاں ہیں۔ معیشت وسیاست پر کنٹرول کرنے کے لیے مغرب امریکہ کی رہبری میں تیل، ٹیکنالوجی، ڈالر، سرمایہ، بجلی، ایٹمی قوت، توانائی، ملٹی نیشنل کمپنیوں اور بین الاقوامی اداروں کے ذریعے مسلم ممالک کو اپنے جدید سامراجی معاشی نوآبادیاتی نظام کے چنگل میں جکڑ رکھا ہے۔ سیاسی آزادی اور معاشی ترقی کے لیے امداد کے لبادے میں سرمایہ دار مغرب نے یہ انتظام کرلیا ہے کہ نہ صرف مسلم بلکہ دوسرے ترقی پذیر ممالک بھی آزاد ہونے کے بعد بھی مغربی معاشی نظام میں بندھے ہوئے ہیں جس کے لیے دوسرے وسیلوں کے ساتھ ساتھ صنعت وحرفت اور ٹیکنالوجی کا علم استعمال کیا گیا ہے جس میں مسلمان بالکل کورے ہیں۔ مغرب کی حاکم قوتوں کا یہ جدید سرمایہ دارانہ نظام ایک دن میں قائم نہیں ہوا بلکہ بتدریج پروان چڑھا ہے جیسے جیسے صنعت کاری کو فروغ حاصل ہوا۔ سرمایہ دارانہ نظام کی جڑیں مضبوط تر ہوتی چلی گئیں۔ اس دوران چونکہ مسلمان صنعت انقلاب کی اہمیت ونوعیت اور ٹیکنیکی چیزوں سے ناآشنا رہے اس لیے ان تین چار صدیوں کے معاشی ارتقا میں ان کا کوئی حصہ نہیں۔ یورپ کی بیداری سے قبل چونکہ مسلمان ریاستیں مشرقی یورپ اور شمالی افریقہ سے لے کر مشرقی ایشیا تک پھیلی ہوئی تھیں چنانچہ یورپ میں صنعتی انقلاب آیا یہ مسلمان ممالک صنعتی مال کی کھپت کے لیے بہترین منڈیاں ثابت ہوئے۔ بالخصوص مشرقِ وسطیٰ میں تیل کے ذخائر نے اسے اقتصادی حیثیت سے بہت سودمند بنا دیا۔ ۱۷۲۳ء میں پیٹر اعظم نے اسے اقتصادی لحاظ سے بہت فائدہ مند قرار دیا۔ اس کے ڈیڑھ سو سال بعد باکو (آذربائیجان) کے چشمے تجارتی حیثیت سے استعمال کیے جانے لگے۔ بعد کی تلاش وتحقیق نے ثابت کردیا کہ باکو اس زیریں سلسلے کی محض ایک کڑی ہے جو جنوبی و مشرقی سمت میں پھیلتا ہوا عراقی کردستان اور ایرانی بختیارستان سے گزر کر جزیرہ نمائے عرب کے ان بنجر خطوں تک چلا گیا ہے جنہیں کبھی کوئی قدر و قیمت حاصل نہیں رہی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دنیائے اسلام عالمگیر وسائل حمل ونقل کا مرکز بن گئی۔ روس اور اوقیانوس کے آس پاس مغربی دنیا کے درمیان نیز ہندوستان، جنوب مشرقی ایشیا، چین اور جاپان کے درمیان جو کم فاصلے والے راستے ہیں وہ سب دنیائے اسلام سے ہو کر گزرتے ہیں خواہ وہ بحری ہوں یا فضائی یا برّی (۲۰)۔ چنانچہ ڈیڑھ سو سال کے قلیل عرصے میں مسلمان ممالک نوآبادیاتی استعمار کے بوجھ تلے دب گئے جس سے آج تک نجات نہیں مل سکی۔ خام مال کو سستا حاصل کرنے کے لیے ان ممالک کو فتح کرکے نوآبادیاتی نظام کا اجراء کیا گیا۔ اور جلد ہی صنعتی ممالک کو

خام مال سستا ملنے لگا اور یہی نوآبادیات تیار شدہ مال کی منڈی بھی بن گئے۔ اس نوآبادیاتی نظام کو ایسے سانچے میں ڈھالا گیا کہ ریاستی ادارے اور مقتدر طبقات اپنے مفاد کے لیے خود اس کی حفاظت کریں۔ براہِ راست نوآبادیاتی نظام کے خاتمے کے بعد ان ریاستوں کو انہی طبقات کے حوالے کیا گیا تاکہ اقتصادی جکڑ بندی قائم رہے۔ محکوم ملکوں میں حاکمیت کے حق کو ''تہذیبی مشن'' کا نام دیا گیا۔ اس طرزِ فکر کو عام کرنے کے لیے نظامِ تعلیم پر بھی مغربی قوتوں کی اجارہ داری قائم کی گئی۔ اس طرزِ عمل نے طبقاتی سسٹم کو پیدا کیا گیا۔ صنعتی انقلاب سے سرمایہ دارانہ نظام اور سرمایہ دارانہ نظام سے طبقاتی سسٹم پیدا ہوا۔ اسی طبقاتی سسٹم کے ذریعے سرمایہ دار مغرب نے عالمِ اسلام پر استعماری و استحصالی شکنجہ مضبوط تر کیا۔ چونکہ مغرب کی فکری نہج یہ ہے کہ حاکمیت کی بنیاد طاقت ہے اور طاقت دولت کی صورت میں اس کے پاس ہے پس حاکمیت کا حق مغرب کو ہے تاکہ وہ محکوم ممالک کو خوشحال بنائے۔ ایک طرف (مغرب میں) جمہوریت، انسانیت، مساوات، انفرادی اور قومی آزادی کے افکار پروان چڑھائے گئے تو دوسری طرف (نوآبادیات میں) صنعت کار اور تجار ایسی حکمتِ عملیاں بنانے میں مصروف رہے جو ان جمہوری اقدار کو محدود کرنے میں مددگار ثابت ہوں۔ چنانچہ مغرب کے اس صنعتی ارتقا کے اثرات ان ممالک میں اور نوآبادیات میں ایک دوسرے کی ضد تھے۔[۲۱] سرمایہ دارانہ نظام کے ''تہذیبی مشن'' کی عیاری مکاری کے مقابلے میں مسلمانوں کا کردار یہ رہا ہے کہ انہوں نے صنعتی انقلاب کے بعد پیدا ہونے والے افکار و عوامل کو سمجھا ہی نہیں انہوں نے یہ سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی کہ صنعتی ترقی اور ٹیکنالوجی کی بدولت مغربی دنیا کدھر سے کدھر جا رہی ہے۔ وہ صنعتی انقلاب کے بعد پیدا ہونے والے افکار کو پہچان ہی نہیں سکے اور انتظامی و عسکری حکمتِ عملی کی اس نئی سائنس کا ادراک کرنے سے محروم رہے۔ نشاۃ الثانیہ نے مغرب میں جدید نظامِ تعلیم ترتیب دیا جبکہ مسلمان درسِ نظامیہ سے چمٹے رہے۔ ان میں اقتصادی علوم سیکھنے اور اس میں مزید تحقیق کرنے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ آج صورتحال یہ ہے کہ مسلمانوں کی لغت میں وہ ہی الفاظ نہیں جو صنعتی افکار کی تفہیم پیدا کر سکیں معدنی تیل کے ذخائر مسلمانوں کے پاس ہیں لیکن تیل نکالنے اور تقسیم و ترسیل کی ترکیب ابھی تک مسلمان نہیں سیکھ سکے۔ چنانچہ تیل کی صنعت امریکہ اور اس کے حواریوں کا کنٹرول ہے یہ تیل مغربی کمپنیاں نکالتی ہیں۔ ان کی تحقیق، تحصیل اور ترسیل مغربی ممالک کے کنٹرول میں ہے۔[۲۲] اس طرح ایک ایسا معاشی نظام ترتیب پایا جس میں مسلم دنیا اور غیر ترقی یافتہ ممالک کے وسائل مغرب کی ٹیکنالوجی کی گرفت میں آ گئے۔ ایشیاء افریقہ غریب تر ہوتے گئے۔ آج سارا عالم اسلام مغرب کے معاشی نوآبادیاتی نظام کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔

مغرب نے اپنے سرمایہ دارانہ نوآبادیاتی نظام کو قائم رکھنے اور اشتراکی نظام کو شکست دینے کے لیے اس کے مقابلے میں ''تدریجی اصطلاحات'' (Progressive Reforms or Revolution) اور ''فلاحی ریاست'' (Welfare State) کا نیا طرزِ فکر پیش کیا۔[۲۳] اس طرزِ فکر کے تحت معاشرے کے

ارتقاء کے لیے انقلاب جیسے خونیں تجربے سے گزرنے کی ضرورت نہیں بلکہ تدریجی اصطلاحات کے ذریعے معاشی بے انصافیوں کا ازالہ ممکن ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے ازخونو آبادیات کو آزادی دینے کے پروگرام مرتب کیے۔ بتدریج اصطلاحات کے نفاذ کی جدوجہد تیز ہوتی چلی گئی، بڑی بڑی انقلابی تبدیلیوں کی بجائے چھوٹی چھوٹی تبدیلیوں کے تحت ریاست کے استحکام اور فلاحی ریاست کا مفروضہ کامیاب رہا۔ اس طرح سرمایہ دارانہ نظام نے اشتراکیت کے مقابلے میں اپنے استحکام کی راہ ہموار کی (یہاں سرد جنگ روس افغان جنگ کے حوالے سے، اشتراکیت کو شکست دینے کے لیے جہاد، مجاہدین اور مذہبی تنظیموں کا نیٹ ورک اور مذہب کا استعمال ــــــ اس کو ذہن میں بھی رکھنا ضروری ہے جس کا ذکر گزشتہ صفحات میں کیا جا چکا ہے)۔ غرض اس طرح ایک نیا نوآبادیاتی نظام رائج کیا گیا جس نے ایشیا اور افریقہ کے ممالک کی سیاسی اور معاشی آزادی کو ایک سراب میں تبدیل کر دیا جبکہ امریکہ و یورپ کا معاشی استعمار جدید بنیادوں پر کام کر رہا ہے۔ نئی نئی صنعتوں، تعلیمی و زرعی اصلاحات، معاشی امداد اور سرمایہ کاری کے باوجود نوآبادیات میں امیری غریبی کا فرق بڑھ رہا ہے۔ مسلم ممالک قرضے کے بوجھ تلے دبتے جا رہے ہیں غربت اور بیروزگاری کے مسائل بڑھ رہے ہیں۔ ''ترقیاتی معاشیات'' کے باوجود گلوبلائزیشن (عالمگیریت) اور اس تحت آزادی کی عالمی تحریک WTO کے ذریعے سرگرمِ عمل ہے۔ اس میں شک نہیں کہ پچھلی دو تین دہائیوں میں امریکہ یورپ، مشرقی ایشیا بالخصوص جاپان میں نئے انداز کی زبردست صنعتی ترقی اور فنی انقلاب برپا ہوا ہے لیکن ابھی تک دنیا کی دو تہائی آبادی غربت و افلاس کی پستیوں میں جکڑی ہوئی ہے۔ تمام تر اصطلاحات و اقدامات کے باوجود کیا عوام الناس معاشی الجھنوں سے آزاد ہو رہے ہیں؟ کیا غربت، مہنگائی، بے روزگاری سے لوگوں کو نجات مل رہی ہے؟ بڑی صنعتیں، کارخانے، شاہراہیں، بجلی گھر، بندرگاہیں، ڈیم تعمیر ہونے کے باوجود کیا ان کا ثمر مفلسی اور معاشی اونچ نیچ کے خاتمے کی شکل میں نکل رہا ہے؟ انسانوں کی معاشی پسماندگی دور ہو رہی ہے؟ یہ وہ سوالات ہیں جو مغرب کی تحریکوں، کتابوں اور علوم کے دہرے پن اور استعماری و سامراجی عزائم نمایاں کرتے ہیں۔ اس صورتحال میں مغرب کی آزاد معیشت سے یہ توقع رکھنا کہ وہ عوام کے تعلیمی، طبی اور رہائش کے مسائل حل کرے گی، اس سرمایہ دارانہ و جاگیردارانہ نظام اور نوآبادیاتی فریب میں ایک خیال خام ہی معلوم ہوتا ہے۔ اس کے برعکس صاف نظر آ رہا ہے کہ امریکہ معدنی تیل کے لیے عالمِ اسلام پر اپنی سامراجی گرفت مضبوط تر کرتا جا رہا ہے۔ اپنے اندروانی اور بیرونی زوال و استحصال کی روایتوں کے سبب اقوامِ عالم بالخصوص اسلامی مشرق و مغرب کے جدید سرمایہ دارانہ نوآبادیاتی سامراجی نظام کے پیچیدہ شکنجوں میں جکڑا ہوا ہے۔ غرض مغربی تہذیب میں اس کے علم، سائنس، ٹیکنالوجی اور جدید تر ترقیاتِ علمی کے باوجود جارحیت اور تشدد موجود ہے۔ یہ ماضی میں بھی تھا اور آج بھی ہے۔ فرق یہ ہے کہ مہذب بنانے کے عمل کا رُخ آج بالخصوص مسلمانوں کی طرف ہے۔ مغربی استعمار امریکہ کی سرپرستی میں ایک نئے سامراجی معاشی

نوآبادیاتی نظام کا لبادہ اوڑھ کر اپنا ''عظیم تہذیبی مشن'' آج بھی اسی شد و مد سے ادا کر رہا ہے جس کی گونج کپلنگ کی اصطلاح ''سفید آدمی کا بوجھ'' میں سنائی دیتی ہے۔ اب اس کا رُخ واضح طور پر اسلام اور دنیائے اسلام کی طرف ہے اور اس کی قیادت اب امریکہ کے پاس ہے۔ اور ہم نے اقبال کی فکر کا مطالعہ اسی قدیم وجدید تر نوآبادیاتی نظام کے تناظر میں کرنا ہے۔

حوالہ جات وحواشی

1. Esposito, John, L, Islamic threat: Myth or reality, New York: Oxford University Press, 1992, P.44
2. huntington, The Clash of Civilizations, PP.201

محمد آصف، ڈاکٹر، اسلامی اور مغربی تہذیب کی کشمکش: فکرِ اقبال کے تناظر میں، لاہور: ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، ۲۰۱۵ء، ص:۶۲

۳۔ اقبال، علامہ محمد، اقبال: تقریریں، تحریریں اور بیانات، ترجمہ: اقبال احمد صدیقی، لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۹۹ء، ص:۲۵۸ تا ۲۶۰

۴۔ مندرجہ بالاصفحات میں شروع سے یہاں تک پس منظر بیان کرنے کے لیے مختلف کتابوں سے مدد لی گئی ہے۔تحقیق کے تقاضوں کے پیشِ نظر کچھ اہم ماخذات کو یہاں درج کیا جاتا ہے۔ دیکھئے:۔

اقبال، علامہ محمد اقبال: تقریریں، تحریریں اور بیانات، ترجمہ: اقبال احمد صدیقی، ص:۲۵۸ تا ۲۶۰

اقبال، تشکیلِ جدیدِ الٰہیاتِ اسلامیہ، ترجمہ: نذیر نیازی، سید، لاہور: بزمِ اقبال، ۱۹۹۴ء، ص:۱۱، ۲۳۰ تا ۲۳۵

عقیل، معین الدین، ڈاکٹر، اقبال اور جدید دنیائے اسلام، لاہور: مکتبۂ تعمیرِ انسانیت، ۱۹۸۶ء، ص:۱۹، ۲۲، ۲۳، ۳۱، ۳۳ تا ۳۵، ۱۳۵، ۱۳۶

جاوید اقبال، ڈاکٹر، زندہ رود، لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۸۷ء، ص ۱۵۸ تا ۱۶۰، ۲۱۴، ۲۹۶

خلیل احمد نظامی، پروفیسر، تاریخی مقالات، دہلی: ندوۃ المصنّفین، ۱۹۶۶ء، ص:۲۶

مودودی، سید ابوالاعلیٰ، تنقیحات، لاہور: مکتبۂ جماعتِ اسلامی، ۱۹۳۹ء، ص:۶، ۷

اکرام، شیخ محمد، موجِ کوثر، لاہور: ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، ۱۹۹۷ء، ص۶؛

افتخار حسین، آغا، قوموں کی شکست وزوال کے اسباب کا مطالعہ، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۹۹ء، ص ۵۸، ۸۸، ۸۹، ۱۰۰ تا ۱۰۳

محمد کاظم، مسلم فکر وفلسفہ عہد بہ عہد، لاہور: مشعل، ۲۰۰۲ء، ص: ۲۹۳

قاضی جاوید، سرسید سے اقبال تک، ص:۹ تا ۱۹

قاضی جاوید، ہندی مسلم تہذیب، ص:۳۲۸ تا ۳۳۱

مزید ملاحظہ کیجیے:۔

ٹائن بی، مطالعۂ تاریخ (حصہ دوم)، تلخیص، سمرویل، ڈی۔سی، ترجمہ: مہر، غلام رسول، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۳ء (طبع اول)، ص ۲۷۷، ۲۸۳؛

Stoddard, L.S, The new world of Islam, New York: Chautauqua Press, 1923, PP.25, 26, 54;
Lewis, Bernard, The Middle East and the west, London: Indiana University Press, 1964, PP.34 and relevant pages
Smith, W.C., Islam in Modern History, New York: New American Library, 959, PP.48 to 51 and relevant pages

5. Hungtington, The Clash of Civilizations, PP.210;
Pipes, Denial, In the path of God: Islam and Political power, New York: Basics Books, 1983, P.102, 103, 169 to 170

۶۔ نئے نوآبادیاتی نظام کی تشکیل، اس کے طریق واردات اور اس کے ظلم واستبداد کے لیے ملاحظہ کیجئے:۔
مبارک علی، ڈاکٹر، تاریخ اور سیاست، ۱۳۲ تا ۱۳۷
محمد آصف، ڈاکٹر، اسلامی اور مغربی تہذیب کی کشمکش: فکرِ اقبال کے تناظر میں، ص ۶۲ تا ۶۴

7. Huntington, The Clash of Civilizations, PP.110
8. Ibid, P.185
9. Khomeni, Ayatullah, Ruhollah, Islam and Revolution, Berkely (C.A): Mirza Press, 1981, PP.305

۱۰۔ سردار نقوی، پروفیسر، مضمون، تہذیبوں کے درمیان تصادم یا تفاہم، مشمولہ: پیغام آشنا (سہ ماہی مجلہ)، ثقافتی قونصلیٹ، اسلامی جمہوریہ ایران، اسلام آباد، شمارہ ۵، ۶ جون ۲۰۰۱ء، ص ۱۹
۱۱۔ افغان سوویت یونین جنگ کے مباحث کے لیے دیکھئے:۔

The New York Times, (Daily Newspaper), New York City: March 20, 1995, P.1

حسن جعفر زیدی، اسلامی انتہا پسندی کا سراب، لاہور: ادارۂ مطالعۂ تاریخ، ۲۰۰۹ء، ص ۵ تا ۷، ۱۰ تا ۱۲، ۱۶ تا ۱۷
محمد آصف، ڈاکٹر، اسلامی اور مغربی تہذیب کی کشمکش: فکرِ اقبال کے تناظر میں، ص ۶۵ تا ۶۶

12. Huntington, The Clash of Civilizations, PP.247
13. Fatima Mernissi, Islam and Democracy: Fear of Modern World, Addison Wesley, Readings, (M.A) 1992, P.102;
Huntington, The Clash of Civilizations, PP.250 to 250;
Economist (weekly Magazine), London: January 26, 1991, PP.31 to 33;
International Herald Tribune (Daily Newspaper), Paris: June 28, 1993, PP.45

محمد آصف، ڈاکٹر، اسلامی اور مغربی تہذیب کی کشمکش: فکرِ اقبال کے تناظر میں، ص ۶۶ تا ۶۹

14. Huntington, The Clash of Civilizations, PP.258 to 263

۱۵۔ ۹/۱۱ اور سے متعلقہ مباحث کے لیے درج ذیل ماخذات سے رجوع کیا جا سکتا ہے۔ ملاحظہ کیجئے:۔

Abu Bakr Karolia, The Clash of Civilizations VS Universal Compassion, at www.nuradin.com/contribution.southAfrica, January13,2003

Economist, August 1, 1992. PP.35, 35

Armstrong, Karen, Holy War, New York: Anchor Books, 2001, PP.vii, ix, 539

Huntington, The Clash of Civilizations, PP.258 to 268

Benard, Cheryl, Civil Democratic Islam, PP.448, 449

ارشاد احمد حقانی، ۱۱/ستمبر۔ تین سال بعد کا منظر، روزنامہ، جنگ ملتان، شمارہ ۲۳۴، جلد ۲، ۱۲/ستمبر ۲۰۰۴ء، ص ۶

روزنامہ جنگ ملتان (سنڈے میگزین) شمارہ ۲۳۴، جلد ۲، ۱۲ ستمبر ۲۰۰۴ء، ص ۶

روزنامہ نوائے وقت، ملتان، شمار ۲۹۸، جلد ۲۴، ۱۹/اپریل ۲۰۰۲ء، اداریہ

روزنامہ جنگ، لاہور، شمار ۲۴۲۰، جلد ۲۳، ۱۴/اکتوبر ۲۰۰۲ء، اداریہ

دنیازاد (کتابی سلسلہ، کتاب نمبر ۱۱)، ترتیب و تالیف، آصف فرخی، جنوری فروری ۲۰۰۴ء، شہرزاد، کراچی، ص ۳۹، ۴۲

کنیز فاطمہ یوسف، اقبال اور عصری مسائل، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء، ص ۳۹۶، ۴۰۲

جاوید اقبال، ڈاکٹر، افکارِ اقبال۔ تشریحاتِ جاوید، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء، ص ۱۲۲

مبارک علی، ڈاکٹر، تاریخ کی آواز، ص ۱۷۵

محمد آصف، ڈاکٹر، اسلامی اور مغربی تہذیب کی کشمکش: فکرِ اقبال کے تناظر میں، ص ۶۹ تا ۹۷

۱۶۔ مبارک علی، ڈاکٹر، تاریخ کی آواز، ص ۱۷۵

۱۷۔ جاوید اقبال، ڈاکٹر، افکارِ اقبال ــــ تشریحاتِ جاوید، ص ۱۲۲

۱۸۔ شمیم حنفی، مضمون، تہذیبوں کا تصادم کا مسئلہ اور اقبال، مشمولہ: دنیازاد، کتاب نمبر ۱۲، ص ۳۹، ۴۲

19. Armstron, Karen, Holy War, PP.vii, ix, 539

۲۰۔ ٹائن بی، مطالعۂ تاریخ (حصہ دوم)، تلخیص، سومرویل، ڈی۔ سی، ترجمہ: مہر غلام رسول، مولانا، لاہور: مجلس ترقی ادب، طبع اول، ۱۹۶۳ء، ص ۲۸۳، ۲۸۴

۲۱۔ عزیز احمد، پروفیسر، اقبال نئی تشکیل، ص ۹۸، ۹۹

۲۲۔ کنیز فاطمہ یوسف، اقبال اور عصری مسائل، ص ۴۸۴

۲۳۔ ایضاً، ص ۱۷۳، ۱۸۷